R. No. 2186/57 Regd. No. L.922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
per Copy-12

جلد ۲۷۔ شمارہ ۴ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء

اداریہ

یوم جمہوریت

ہماری جمہوریت ۲۶ جنوری کو اٹھارہ سال کی ہو جائے گی۔ ادھر چند سال سے ملک جن مشکلات میں مبتلا ہے اور خصوصاً گذشتہ سال جو واقعات ہوئے ہیں ان کی وجہ سے کچھ لوگوں میں خاصی بد دلی ہے اور وہ جمہوریت کی موجودہ پارلیمانی شکل سے کچھ مایوس ہونے لگے ہیں لیکن غور کرنے پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جمہوریت کو زبان سے مان لینے کے باوجود ابھی تک ہم نے جمہوریت کی روح کو نہیں سمجھا ہے اور اس نظام کی سہولتوں کو تو پیش نظر رکھا ہے اس کی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کی آبادی پچاس کروڑ سے اوپر ہے۔ اس کے مختلف خطوں میں آب و ہوا اور معاشرت کا بڑا فرق ہے۔ اس میں چودہ بڑی قومی زبانیں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہمارے دستور میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ ملک کے سب باشندوں کو برابر کے حقوق ملیں، چھوت چھات ختم ہو، ہر شخص کو تحریر و تقریر کی آزادی ہو، ہر ایک کے مذہب زبان، رسم خط کا تحفظ ہو، وہ اپنے پیشے کو آزادی سے چلا سکے، پھر بھی ذاتی ملکیت کے تحفظ اور سوشلزم پر نظر، دونوں پہلوؤں میں توازن کی کوشش نے یہ مسئلہ ضرور پیدا کر دیا ہے کہ دستوں کو قومیانے میں کچھ دشواریاں ہیں اور بڑی پونجی رکھنے والوں کے اثر کو کم کرنا آسان نہیں۔ پھر ہمارا نظام وفاقی یونین ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ریاستوں کو بہت سے معاملات میں مکمل آزادی ہے، صرف ان معاملات میں جن سے پورے ملک کا تعلق ہے یعنی بچاؤ، مالیات، ریل و رسائل اور بیرونی امور، ان میں مرکز تمام ریاستوں پر اپنی پالیسی نافذ کر سکتا ہے۔ یہیں سے ہماری مشکلات کا آغاز ہوتا ہے یعنی جہاں ریاستوں کو بیشتر معاملات میں آزادی ہے، وہاں کچھ پابندی بھی ہے۔ جب ایک پارٹی کی حکومت مرکز اور ریاستوں میں تھی تو مسئلہ آسان تھا۔ اب جبکہ کئی ریاستوں میں مخالف پارٹیوں کی مخلوط وزارتیں ہیں، ظاہر ہے کہ مرکز اور ریاستوں کے درمیان تناؤ ہے۔ پھر لسانی ریاستوں کے قیام نے قدرتی طور پر محدود وفاداریوں کو جنم دیا ہے اور مرکز میں ایک زبان کا مسئلہ اختلاف کا سبب بن گیا ہے۔ ادھر لسانی اقلیتوں کے حقوق کی جو حفاظت دستور میں سوچی گئی تھی اس کا عملی دنیا میں لحاظ نہیں رکھا گیا اور قول اور عمل میں خاصا فرق ظاہر ہو گیا ہے۔ اس لیے ملک میں تشدد بڑھ رہا ہے۔ لوگ غذائی مشکلات اور بے روزگاری کے آسیب سے پریشان ہو کر توڑ پھوڑ پر اتر آئے ہیں۔ کچھ سیاست دانوں نے لوگوں کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر ایسے کھیل کھیلے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو کسی چیز پر اعتبار نہیں رہا۔ ان حالات میں یوم جمہوریت کے موقع پر ہم سب کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنی اٹھارہ سال جمہوریت کے سارے تجربے کو ذہن میں رکھیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم نے جمہوریت اور سیکولرزم کو اپنانے میں غلطی تو نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ ہمارا یہ فیصلہ ہر طرح درست تھا کیونکہ غلطیاں جمہوریت کی وجہ سے نہیں ہوئیں۔ جمہوریت کی روح کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے اور من مانی کرنے کی وجہ سے ہوئیں۔ اس لیے جمہوریت کی روح کو عام کرنا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنے اختلافات کو تشدد کے ذریعے سے نہیں، بلکہ تبادلہ خیالات کے ذریعے، ایک دوسرے کی سننے کے ذریعے اور ایک مجموعی رائے بنانے سے کریں گے۔ اگر یہ بات سب کے دل میں اتر جائے اور تشدد کو ہر حال میں روکا جائے، بلکہ تشدد کے ذریعے سے فیصلہ کرنے کو ناپسند کیا جائے تو ہم یقیناً اپنی جمہوریت کو ایک قدم آگے لے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارا فرض یہ ہوگا کہ ہم مرکز کو ان امور کے لیے تو مستحکم بنائیں جن کا تعلق سب سے ہے لیکن ریاستوں میں بڑی حد تک اندرونی خود مختاری کے اصول کو تسلیم کریں۔ اس طرح ریاستوں کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ مرکز ریاستوں کے اپنے معاملے میں دخل نہ دے گا اور وہاں مختلف سیاسی پارٹیوں کے وجود کو گوارا کرے گا۔ اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کیا ہم عوام کا معیار زندگی بلند کرنے اور پس ماندہ طبقوں کو اوپر لانے کے راستے میں رکاوٹیں گوارا کریں گے۔ پھر یہ سوچنا ہوگا کہ کیا سیکولرزم کا نام لینا ہی کافی ہے اور ہم عملی زندگی میں اسے نافذ کرنے کے لیے مناسب اقدامات کیوں نہیں کرتے۔ اس پر غور کے دوران یہ بات واضح ہوگی کہ ہمارے ملک میں ذرا سی بات پر فرقہ وارانہ فسادات کیوں ہو جاتے ہیں۔ کیوں ہم اس علاقے

کے ذمہ دار افراد کے خلاف آئینی کارروائی نہیں کر پاتے، کیوں کچھ جماعتیں فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور کیوں ہنگامہ اور کشت و خون کرنے والوں کو اتنی سزا نہیں ملتی۔ یعنی ہم کو نہ صرف سیکولرازم کو بچانے کے لیے بلکہ امن عامہ کو استحکام دینے کے لیے فرقہ وارانہ فسادات کو سختی سے روکنا ہے خواہ اس میں کیسی ہی آئینی کارروائی کیوں نہ کرنی پڑے۔ فرقہ وارانہ فسادات سے نہ صرف اقلیتوں میں ہراس پھیلتا ہے۔ نہ صرف امن عامہ مجروح ہوتا ہے بلکہ قومی دولت برباد ہوتی ہے۔ قومی ترقی کی جدوجہد سست پڑ جاتی ہے اور ہمارا ذہن بڑے مسائل کے حل کی طرف سے ہٹ کر ان چیزوں میں پڑ جاتا ہے جو بہت پہلے ختم ہو جانی چاہئیں تھیں۔ اس کے ساتھ زبانوں کے متعلق اپنے رویہ پر کڑی تنقیدی نظر ڈالنی ہوگی۔ جب ہم نے سب زبانوں کو قومی مان لیا تو پھر سب کو یکساں ترقی کے مواقع بھی فراہم کرنے ہوں گے۔ جب دستور کی دفعہ ۳۴۵ اور ۳۴۷ میں یہ گنجائش موجود ہے کہ ایک ریاست میں ایک سے زیادہ زبان سرکاری طور پر تسلیم کی جا سکتی ہے اور اس کا مطالبہ صاف اور واضح الفاظ میں ہو رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو کو ان ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والے معقول تعداد میں ہیں اس طور پر تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ کہنا کہ اس سے علاحدگی پسندی کو تقویت ہوگی درست نہیں ہے کیونکہ جب لسانی اقلیتیں مطمئن ہوں گی تو وہ قومی یکجہتی میں اور بھی سرگرم ہوں گی۔ آخر میں حکومت کو حکومت کرنے کے لیے اور ملک کو متحد اور مضبوط رکھنے کے لیے خود بھی آئینی مضبوط پالیسی اختیار کرنا پڑے گی تاکہ لوگ اس مضبوطی کا احترام کرنا سیکھیں اور یہ نہ سمجھنے لگیں کہ کچھ مظاہروں سے حکومت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جمہوریت پر عقیدہ اور اعتماد پیدا کرنا ہوگا، پھر اس کی روح پر ہر حال میں عمل کرنا ہوگا، پھر مرکز کے اختیار اور ریاستوں کی اندرونی آزادی کے حدود متعین کرنے ہوں گے، پھر اقلیتوں کو مطمئن کرنا ہوگا اور ان کے لیے قومی زندگی میں باعزت جگہ نکالنی ہوگی۔ پھر تمام زبانوں کو ترقی کے مواقع دینے ہوں گے۔ پھر قانون کی حکمیت کو مضبوط کرنا ہوگا۔ پھر عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور تعلیم کو معنی خیز اور کارآمد بنانے کے ذرائع اختیار کرنے ہوں گے۔ تب جا کر ہمارا ملک موجودہ مشکلات سے نکل سکے گا اور اپنی منزل کی طرف گامزن ہو سکے گا۔ ہمارا کام بڑا ہے لیکن ہم میں اس کی صلاحیت ہے کہ اس بڑے کام کو خوش اسلوبی سے پورا کر سکیں۔ ہاں اس کے لیے ہم کو ذہنی اور جذباتی طور پر بلند ہونا پڑے گا اور تمام چھوٹی چھوٹی وفاداریوں کو چھوڑ کر پورے ملک کے مفاد کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اگر ہم اپنے اندر یہ بڑائی پیدا نہ کر سکے تو وقت کا فیصلہ ہمارے خلاف ہوگا۔ اگر ہم اپنے آپس کے جھگڑوں اور چھوٹے چھوٹے مسائل سے نکل کر پورے ملک کے مفاد کو ملحوظ رکھ سکے تو ہم اپنے وطن کو بام ترقی پر ضرور پہنچا سکتے ہیں۔ ضرورت صرف یقین محکم اور عمل پیہم کی ہے اور اس محبت کی جو فاتح عالم ہے۔ ہماری زبان کے پڑھنے والوں کو ہم یوم جمہوریت کی مبارکباد دیتے ہیں۔

سطوت رسول

سرِ شام

شام سے یہ بجھے بجھے تارے!
ہیں کسی گوشۂ ملال میں گم
قطرہ قطرہ بکھر رہی ہے شام
درد کے مرمریں جھروکوں سے
شب کی تیرہ سیاہ وادی میں
اور چپ چاپ رکھ رہی ہے قدم
گھنگروؤں کی صدائیں مدھم ہیں
جانے کتنے سروں کے سرگم ہیں

اک حسینہ اٹھی ہے لہراتی
پائلوں کی صدا سے چونکاتی
اس کی زلفوں کی بھینی بھینی ہوا
آ رہی ہے گداز جسم سے پار
بکھر رہی ہے کہ نیم ہوش جواں!
ڈھل رہی شراب لالہ گوں
درد کا چاند بجھنے والا ہے!؟

لکھنؤ میں یوم منشی نولکشور منایا گیا

لکھنؤ۔ یوپی کے گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی نے یوم منشی نولکشور کی صدارت کرتے ہوئے منشی نول کشور کی تصویر کی نقاب کشائی کرتے ہوئے کہا کہ بڑے آدمی آئندہ نسلوں کے لیے اپنے قدموں کے نشانات چھوڑ جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے نقش قدم پر چل کر انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ منشی نول کشور ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۹۵ء میں ہوا تھا۔ انہوں نے لکھنؤ سے ۱۸۵۸ء میں اردو اخبار شائع کیا تھا اور ایک اردو چھاپہ خانہ معیاری کتب مناسب داموں پر چھاپنے کے لیے قائم کیا تھا۔ حکومت کی جانب سے انہیں سی آئی ای کا خطاب اور قیصر ہند کا تمغہ ملا تھا۔ ان کا شمار انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

ادیبوں اور اخبار نویسوں کے لیے پنجاب میں کالونی

گرداس پور۔ شری گیان سنگھ نے بیان کیا ہے کہ پنجاب میں ادیبوں، اخبار نویسوں اور مصنفوں اور شاعروں کے لیے ایک کالونی بنائی جائے گی۔ ان کے بچوں کو ہائی اسکول تک مفت تعلیم دی جائے گی اور طبی امداد دی جائے گی۔

طیب انصاری

دورِ آصفی کے اردو رسائل

ماہنامہ صحیفہ حیدرآباد کی صحافت پر جب بھی قلم اٹھایا جائے گا صحیفہ کے کارناموں پر روشنی ڈالنا مورخ کے لیے فرض ہے۔ صحیفہ خادم ادب بھی تھا اور دورِ آصفی کا سب سے پہلا خادم ملک و ملت بھی۔ صحیفہ عرصہ دراز تک ماہ نامہ کی حیثیت سے ادب اور ادبی مسائل کو پیش کرتا رہا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے صحیفہ نے اپنے پیش رو ماہ ناموں سے کہیں زیادہ سلجھا ہوا طریقِ عمل اختیار کیا اور زیادہ مدلل پیش کرتا رہا یہی بات اسے اپنے ہم عصر ماہ ناموں میں امتیازی مقام دلاتی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں موسوم بہ اسم تاریخی صحیفہ کے نام سے جاری ہوا لیکن قلیل مدت کے لیے ہوا[1] اس وقت تک حبیب الدین حسن کیفی ہی اس رسالے کے مالک مہتمم اور مدیر تھے لیکن جب انجمن معارف کے زیر اہتمام اس کی دوبارہ اشاعت ۱۹۰۷ء میں عمل میں لائی گئی تو اس کی ادارت کی ذمہ داری اکبر علی کو سونپی گئی ۱۹۱۲ء تک یہ رسالہ کی صورت میں شائع ہوتا رہا اور اس کے بعد روزنامہ میں بدل دیا گیا۔ اب صحیفہ ہر روز شام میں شائع ہونے والا خادم ملک و ملت بن گیا تھا۔ اور اکبر علی کے انتقال ۱۳۶۱ھ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک جاری رہنے کے بعد پھر بند ہو گیا۔

کیفی بدایت شکن شاعر تھے اور جن موضوعات پر انھوں نے نظمیں لکھی ہیں ان کے پیش نظر نصیر الدین ہاشمی نے انھیں دکن کا حالی قرار دیا ہے۔[2] ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں بمقام اجمیر شریف انتقال کر گئے کیفی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ دار العلوم میں ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی کا امتحان پاس کیا اور کم عمری سے شعر کہنے لگے تھے حضرت داغ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا چنانچہ داغ کے بعد کیفی ہی استاد دکن کہلائے داغ کے جلائے ہوئے چراغ کو انھوں نے اپنے خون جگر سے روشن رکھا کیفی کے شاگردوں میں صفی اورنگ آبادی دکن کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ بلاشبہ کیفی کے یہاں استاد کا رنگ نمایاں تھا وہی شوخی بیان، وہی لطف زبان، وہی خیال کی رنگینی اور عاشقانہ مضمون آفرینی لیکن انھوں نے بہت جلد فرسودہ ڈھب کو چھوڑ کر نیا آہنگ اختیار کیا موضوعاتی نظمیں کہنے لگے چنانچہ "شکر نعمت"، "قرض حسنہ"، "تعلیم"، "جام حیدری"، "ثمر" اور "خدا حافظ" وغیرہ ہی وہ نظمیں تھیں جو شہر کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔

کیفی صرف شاعر ہی نہیں نقاد بھی تھے چنانچہ انھوں نے اپنے رسالہ صحیفہ میں "اصول تنقید" پر خود قلم اٹھایا اور دوسروں کو بھی تنقیدی مضامین لکھنے پر اکسایا ہے چنانچہ ترغیب و ترہیب آورد کے عنوان سے تسلی کا آمد اور آورد پر قول فیصل کے زیر عنوان لمعہ کا مضمون جلیل اور بانی کے کلام میں توارد اور سید جلال کے مضمون کا جواب تھے شائع ہوئے۔ ان علمی اور تنقیدی بحثوں سے فن اور ادب کے کئی گوشے بے نقاب ہوئے ہیں۔

۱۹۰۵ء سے صحیفہ جاری تو ہوا تھا لیکن جشن عشرت کی سرپرستی میں شائع ہونے والا یہ ماہ نامہ بہت جلد بند ہو گیا۔ بعد کو انجمن معارف کی جانب سے ۱۳۲۸ھ کو پھر جاری ہوا اس بار اکبر علی بھی ایڈیٹر کی حیثیت سے شریک کار ہو گئے اور دفتر صحیفہ پریس بیرون دروازہ چار کمان منتقل ہو گیا۔

محمد اکبر علی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے مدرسہ تعلیم المتعلمین سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور دار العلوم میں شریک ہو گئے جہاں سے پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحان پاس کر کے صدر محاسبی میں ملازم ہو گئے لیکن بہت جلد غلامی کا جوا اتار پھینکا اور اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ صحیفہ سے منسلک ہونے کے بعد ۱۹۱۲ء میں صحیفہ کو ماہ نامہ سے روزنامہ میں بدل دیا۔

صحیفہ ادبی اور تنقیدی مضامین کے لیے مشہور تھا۔ صحیفہ کی اشاعت تک ادب میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی جیسے مسائل پر بحثیں شروع نہ ہوئی تھیں کیفی ادبی نقاد تھے لیکن انھوں نے ادب کے بامر زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ ملانے کی جرأت رندانہ بھی فرمائی ہے چنانچہ یہ بات خود کیفی کے کلام سے عیاں ہے کہ انھوں نے ادب اور شاعری کو رنگ و روپ کا نہیں تیشہ زنی کا فن جانا۔ سماجی موضوعات پر قلم اٹھایا اور زندگی کے مسائل کو زبان شعر میں کہنے کی سعی کی ہیں کہ صحیفہ پر بھی اسی طرز فکر کی پرچھائیں نظر آتی ہے۔ رسالہ صحیفہ کو محمد مرتضیٰ، محمد مظہر، ظفر حسن، عبد الرزاق بسمل، عبد الوہاب عندلیب، احمد مصطفیٰ المدعو حیدرآبادی، بسمل حیدرآبادی، اللہ بخش، ملا عبد الباسط، مولوی عبد القدیر اور اکبر علی کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ اس رسالہ میں جہاں ادبی مضامین شائع ہوتے رہے وہیں مذہبی، سیاسی اور تاریخی مضامین کو بھی جگہ ملتی رہی۔ ۱۹۱۲ء کو جب صحیفہ روزنامہ میں بدل گیا بحیثیت رسالہ اس کی زندگی کے دن پورے ہوئے لیکن روزنامہ صحیفہ میں بھی تاریخی اور ادبی مضامین کو جگہ ملتی رہی۔ صحیفہ حیدرآباد کا قدیم اخبار ہونے کی وجہ سے اکبر علی مرحوم کو اس کی قدامت پر بڑا ناز تھا چنانچہ اس کے سرنامہ پر تحریر تھا۔۔۔ "سب سے قدیم خادم ملک و ملت" اس کی پہلی جلد کا پہلا شمارہ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ کو شائع ہوا تھا۔

ماہ نامہ دبدبۂ آصفی "فسانۂ آزاد" کا مصنف تلاش روزگار میں اپنے ہم عصروں کی طرح حیدرآباد پہنچا تو قدر دانوں نے بہت افزائی کی، دلاسہ دیا اور مہاراجہ کشن پرشاد کی امداد و اعانت سے صحیفہ نگار بن گیا۔ ۷ ربیع الثانی ۱۳۰۹ھ کو یہ ناول نگار ایک ماہ نامہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں داخل ہوا ویسے اودھ پنچ بطور آزاد تو اپنے ساتھ لایا تھا اور یہی آزاد تو دہ "دبدبۂ آصفی" کی مدد سے شہر بھر میں تقسیم کرتا پھرنے لگا۔ دبدبۂ آصفی کی جلد اول شمارہ ۱ کے سرورق پر لکھا ہے۔

"اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ میر محبوب علی خاں بہادر کی تقریب سالگرہ مبارک کی تہنیت میں پیدا ہوا اور رسالہ جس میں نظم و نثر کے اخلاقی، علمی، سوشل، ظریفانہ مضامین ہوں گے اور جس کے بانی مبانی عالی جناب راجہ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد المخلص بہ شاد دام اقبالہ پیشکار و وزیر افواج سرکار عالی ہیں حسب الارشاد محتشم الدولہ زیر نگرانی ٹھاکر پرشاد صاحب شوق۔"

اداریہ میں دبدبۂ آصفی کی پالیسی کے بارے میں درج ہے۔

"کئی سال ہوئے راجہ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر فوج آصفی دام اقبالہ کی آرزو تھی کہ ایک اعلیٰ درجہ کا رسالہ ماہواری اردو زبان میں اس طرح شائع ہو جس طرح انگریزی رسالے

---

[1] دکن میں اردو (بار سوم) ص ۴۹۹

[2] حیدرآباد کے ادیب ص ۳۱۹ مرتبہ زینت ساجدہ۔

نکلتے ہیں کیونکہ اردو میں گو اخباروں کی اشاعت بلحاظ کثرت سے ہے اور ماہانہ اور ہفتے میں دو بار ہفتہ وار ہفتہ میں دو مرتبہ روزانہ طبع ہوتے ہیں اور مثل جام جہاں نما میں ہم لوگ گھر بیٹھے تمام دنیا کے حال سے واقفیت حاصل کرتے ہیں مگر اس قسم کے رسالے کی اشد ضرورت تھی جیسے (فورٹ نائٹلی ریویو یا نیشنل میگزین یا کوارٹرلی ریویو) وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ دبدبہ کو اسی نہج پر نکالنے کی کوشش کی گئی۔ پالٹکس سے بحث نہیں کی گئی، مذہبی جھگڑوں سے دامن بچا لیا گیا اور کل مضامین میں متانت اور سنجیدگی سے کام لیا گیا۔ ہاں ظریفانہ خیالات البتہ بعنوان اصلح کا العام شائع ہوا کرتے تھے کیونکہ بقول سرشار ہم آدمی محرم کی پیدائش نہیں ہیں۔ لیکن ظرافت میں کوئی مضمون نگار دائرہ اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا۔ جہاں تک سرشار کی پرورش کا معاملہ تھا مہاراجہ شاد نے بسبب خاطر اس کا منافع سرشار کے نام مخصوص کر دیا تھا۔

جہاں تک اس رسالہ کے ادبی معیار کا تعلق ہے مختلف موضوعات پر اسی تحریر انداز میں بحث ہوا کرتی تھی شعر و شاعری کے زیر عنوان تنقیح شعرا اور زبان و بیان کی غلطیوں کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ طویل مضامین سے اجتناب برتا جاتا تھا چنانچہ دبدبہ آصفی کے شمارہ صفر المظفر ۱۳۱۸ھ میں سرشار نے ایک مضمون نگار کے بارے میں لکھا ہے "بعض حضرات نامہ نگاران ذی شان نے ایسے بھیجے جن کی نسبت عنوان مندرجہ بالا (طول امل) کی پھبتی ٹھیک عاید ہوتی ہے۔ مضمون کیا ہیں کہ طول امل سے بھی کہیں زیادہ۔ پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا جائے، اور ناظرین کو اس کڑی منزل میں چلتے چلتے تھک کے زبان حال و قال دونوں سے دبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی کا یہ مصرع پڑھنا پڑے —

ہیں سست قدم دن کوئی دو چار گھڑی ہے

مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے مضامین میں بہترین مضمون پر اشرفی دی جاتی تھی چنانچہ حکیم برہم کے جس مضمون پر اشرفی دی گئی وہ تھا "اردو ہندوستان کی عام زبان ہے"۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے تصنیف کردہ ناول "جنگل نار" اور "بحر امواج" اسی ماہ نامہ کے صفحات پر پہلی بار شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ خود سرشار کے بیشتر مضامین کے علاوہ "شیدائی" کی آنت اس ماہ نامہ کی زینت کو بڑھاتے رہے ہیں۔ "دبدبہ" میں دلچسپ اقتباسات شائع ہوا کرتے تھے مثلاً صفر المظفر ۱۳۱۶ھ کے رسالہ میں چند اقتباسات دئے گئے ہیں:

"ولایت میں ایک امریکی سوداگر مسٹر ہول کا دیوالیہ نکلا۔ یہ شخص بڑے بڑے تجارتی کارخانوں کا بانی تھا اور اتنا مالدار کہ پانچ کروڑ روپیہ کا ایک چیک خیراتی کاموں کے لیے دیا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ گھاٹا کیونکر ہوا۔ (دبدبہ)"

"مہاراجہ فرید کوٹ نے راج کنیا کی شادی کے جہیز میں چار لاکھ روپیہ نقد، زیورات قیمتی ۲ لاکھ روپیہ، دو ہاتھی مع ہودج نقرئی، ۱۰۰ گھوڑے، گائیں اور بھینسیں علاوہ بہت سی چیزیں دی ہیں اور گیارہ لاکھ برائے خرید جائداد کل سترہ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ (انیس ہند)"

"زیر آب کشتی: حال میں ایک کشتی ارگوناٹ نامی مسٹر سیمن لیک مقام ٹیلو (امریکہ) نے تیار کی ہے۔ یہ سب سے عمدہ ہے اس میں صرف یہی نہیں کہ اس کے لوگ پانی کے اندر تک جو ز دواں کی کشتی کے رہ سکتے ہیں بلکہ وہ اس کشتی سے اتر کر سمندر کے اندر پھر سکتے ہیں اور سرنگ لگی ہوئی دیکھ کر توڑ سکتے ہیں اور جدید سرنگ لگا سکتے ہیں اور بقول کسی کے دریائی حیوانوں سے تعلق پیدا کر سکتے ہیں۔ پس زمانہ حال کے آہنی جنگی جہاز آئندہ بالکل بیکار ہو جاویں گے کیونکہ آئندہ سے سمندر کے اندر سے جنگ ہوگی۔" (نجم الاخبار)

جہاں تک زندگی کے سنجیدہ مسائل کا تعلق ہے دبدبہ نے ایسے موضوعات کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ چنانچہ "اردو ہندوستان کی زبان ہے" ایک مضمون ہے جبکہ ہندوستان میں ہندی اور اردو کا تنازعہ زوروں پر تھا اور اس لسانی مسئلہ کی وجہ سے عام طور پر ہندو مسلم تعلقات میں تناؤ پیدا ہو چکا تھا اس تعلق سے حکیم برہم نے لکھا ہے:

"ہر ایک شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اگر اس کے مزاج میں صلاحیت ہو تو یا بالطبع ایسے امور کو ناپسند کرے گا جن سے ہندو اور مسلمانوں کے برادرانہ اور سوشل تعلقات پر ناگوار اثر پڑنا ممکن ہو۔ بالخصوص عام ملکی زبان کی نسبت کسی قسم کا اظہار اختلاف بہرحال قابل نفرت جس نے اردو اور ہندی کے نام سے ایک مکروہ سوال کی صورت اختیار کی ہے۔ ہندوستان کی یہ دو خاص قومیں جنہیں سر سید مرحوم نے دلہن کی دو آنکھوں سے ایک موقع پر تشبیہ دی تھی جہالت اور خود غرضی کی لغزشوں میں مبتلا ہیں۔ اس میں بدقسمتی سے اس ناگوار سوال نے نہایت منحوس اضافہ کر دیا ہے۔" (دبدبہ ربیع الثانی ۱۳۲۲ھ)

"دبدبہ" کے لکھنے والوں میں مہاراجہ کشن پرشاد اور سرشار کے علاوہ عزیز الدین خان عزیز، شاکر لکھنوی، حیدر لکھنوی، مرزا اکرم علی، رنگ راؤ، منوہر لال زتشی لکھنوی، سید محمد منصب دار، رفیع الدین رفعت، وغیرہ شامل ہیں۔ ہیرا لال نائب مدیر اور شوق مہتمم رسالہ کی حیثیت سے دبدبہ سے وابستہ رہے ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں سرشار کثرت شراب نوشی کی وجہ سے تقریباً دو ماہ علیل رہنے کے بعد انتقال کر گئے جس کی وجہ سے دبدبہ کی اشاعت بھی موقوف ہو گئی۔

ماہ نامہ "تاج"

ماہ نامہ "تاج" اپنے وقت کا مقبول رسالہ تھا اور دیگر معاصر رسائل میں سب سے زیادہ معیاری اور وقیع سمجھا جاتا تھا۔ جنوری ۱۹۱۴ء کو اس کی پہلی جلد کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور انگریزی مہینے کے آخری ہفتے میں اس کی اشاعت عمل میں آتی۔ اس کا مستقل حجم ۴۰ صفحے تھا اور اس محدود ضخامت کے باوجود معیاری مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ غلام محمد انصاری وقار نے "تاج" کی پالیسی پر پہلے ہی شمارہ میں اظہار خیال کیا ہے: "ہم نے یہ قصد مصمم کر لیا کہ "تاج" جاری کر کے اخبارات و رسائل کی قلیل تعداد میں ایک اچھے رسالہ کا اضافہ کریں۔ اور ریاست سے الگ رہ کر گورنمنٹ سے بعض اشاعت تعلیم کا مطالبہ کریں جو ملک و قوم کی سرسبزی و ترقی کی ذمہ دار ہے۔ ... ہم حیدرآباد کی موجودہ معاشرت میں جو محض کورانہ تقلید کا بہترین نمونہ ہے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش

کرتے گئے۔ ہم ملک میں بہترین خیالات کی اشاعت کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور ہم یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ زبان اردو کے خزانے کو عمدہ زبان کی دولت سے مالا مال کریں۔" وفا کے اس دعوی پر مجھے محبوب حسین جگر کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو انھوں نے حیدرآبادی رسائل و اخبارات کے متعلق کہا تھا ان کے خیال میں تو ہم یہ کہ کر اُٹھ ریاست حیدرآباد کے سیاسی و سماجی شعور کے ارتقا میں نہ صرف یہ کہ یہاں کے اخباروں کا اہم حصہ ہی رہا ہے بلکہ یہ کہ اخبارات ہی نے اس مصنوعی اور آمرانہ ماحول کو ختم کرنے میں پہل اور قیادت کی ہے[1] در اصل قدامت پرستی اور وفا کے الفاظ میں حیدرآباد کی معاشرت میں جو کورانہ تقلید روا تھی اس کے خلاف سب سے پہلے جو آواز بلند ہوئی وہ "تاج" ہی کی تھی معاشرے کی فرسودہ قدریں اور مذہب کے غلط تصور نے سماج کو خرافات میں الجھا دیا تھا روایت پرستی عام تھی۔ تاج کی یہ بنیادی پالیسی تھی کہ اس روایت کو توڑا جائے اور مذہب اسلام کا صحیح تصور عام ہو چنانچہ عام شماروں میں اخلاقیات اور اسلامیات پر مضامین کے علاوہ جنوری ۱۹۱۹ کا شمارہ میلاد نمبر نکالا گیا۔ اس سے وفا کی اسلام سے وابستگی اور وفاداری کا ثبوت ملتا ہے

"تاج" مذہبی اور تمدنی اعتبار سے روایت شکن ماہنامہ تھا اس وجہ سے بہت جلد ہمہ گیر شہرت کا مالک بن گیا معاشرتی اور سماجی پالیسی کے علاوہ اردو زبان و ادب کی خدمت بھی اس کے فرائض میں داخل تھی چنانچہ علمی و ادبی مضامین جگہ پاتے رہے ہیں تاثیر اردو علم و ادب رضی الدین کیفی اکبر اور اس کا مرتبہ رفیع احمد قوی تعلیم محمود حسن، اور فسانہ نیک ترجمہ از ظلم لارڈ انفر یٹیٹسن احسن صدیقی تاج کے ادبی اور علمی مضامین میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں جہاں تک تاریخ زبان اردو کا تعلق ہے تاج میں سب سے پہلی بار "اردو کے متعلق" کے عنوان سے سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی نے مضمون لکھا۔[2] اس مضمون میں ہوش بلگرامی نے اردو زبان کی تاریخ سے بحث کی ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ ہند میں اردو زبان کی بنیاد اس وقت پڑی جبکہ اسلام کے بڑھتے ہوئے جنگی و تمدنی فتوحات کے سیلاب عظیم کا رخ افغانستان کے سر بفلک کوہ و پہاڑوں کی بلندیوں سے ہندوستان کے میدانوں کی طرف پھرا۔ گو یہ نظریہ جدید تحقیق سے باطل قرار پاتا ہے لیکن اس مضمون کی اس سے اہمیت کم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابھی جبکہ اردو زبان کی تاریخ تاریکی میں تھی اس قسم کے مضامین کا لکھنا اور مباحث کا

غزل

گلوں سے نکلی نہ صحن چمن سے نکلی ہے
یہ بوئے مست ترے پیرہن سے نکلی ہے
خیال و خواب کی شرمائی نت نئی دلہن
جدید ذہن کے اقلیم فن سے نکلی ہے
شفق میں گونجی، ستاروں میں، چاند میں گونجی
صدا جو ذہن رسا کے دہن سے نکلی ہے
ہے آج جس سے معطر یہ عالم آفاق
وہ بوئے عہد وفا کوہ کن سے نکلی ہے
غزل کی بزم میں جدت کی تابناک کرن
نئی لگن سے انئے بانکپن سے نکلی ہے
تلاش جس کی زمانے کو تھی زمانہ بھر
وہ صبح شب کے اندھیرے کفن سے نکلی ہے
نہیں نہیں وہ شام بہار کو بھی نصیب
صبا وہ بو جو کسی گلبدن سے نکلی ہے

چھیڑنا بجائے خود اہم بات ہے۔

"تاج" مسلسل چار سال تک جاری رہا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے بند کر دیا گیا، البتہ پھر ۱۹۲۳ء میں اس کے سلسلہ جدید کا آغاز ہوا چنانچہ وفا اس کے اداریہ میں لکھتے ہیں۔ "دور قدیم بہت ہی مایوس کن ثابت ہوا باوجود تین چار سال کی انتھک کوششوں کے ہم نے دیکھ لیا کہ صرف ملک دوست احباب نے ہی اس کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ الٹے کئی بہی خواہ حضرات نے بھی توسیع اشاعت میں حصہ نہیں لیا جس سے نیازمند نے ساڑھے چار ہزار روپیہ کی کثیر نقصان برداشت کر کے بادل ناخواستہ تاج کو اور اس کو بند کیا۔" لیکن دور جدید بھی زیادہ دنوں جاری نہ رہ سکا اور چند سالوں کے بعد یہ رسالہ پھر بند ہو گیا۔

تاج کے مضمون نگاروں میں رضی الدین کیفی، سید ہاشمی، حامد حسین قادری، ذہین، رعنا، محمد حسین آزاد حیدرآبادی، افسر، محمد احسن، شمس اللہ قادری اور ضیاء الدین ہاشمی، سلطان احمد، آغا حیدر حسن دہلوی، عماد الملک اور ہوش بلگرامی شامل تھے۔ رسالہ معارف کی رائے میں یہ رسالہ ہندوستان کے بعض مشہور پرچوں سے کم نہیں تھا اور رسالہ اردو کی رائے تھی کہ حیدرآباد سے نکلنے والے پرچوں میں بہترین رسالہ تھا۔ سید شمس اللہ قادری کی کتاب "اردوئے قدیم" در اصل "تاج" ہی کا ایک خاص شمارہ تھی۔

ماہنامہ ذخیرہ

ماہنامہ "ذخیرہ" کی اشاعت ذخیرہ پریس اندرون دروازہ چادر گھاٹ سے ماہ اکتوبر ۱۹۱۸ء سے عمل میں آئی۔ حیدرآباد کے قدیم و جدید رسائل کی طرح یہ بھی بیک وقت علمی، ادبی، اور مذہبی مضامین پیش کرتا رہا قیمت فی پرچہ ۶ر ہوا کرتی تھی اور کوئی ۸ صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا تین سال تک شائع ہونے کے بعد صاحب داستان ادب حیدرآباد کے بیان کے مطابق ۱۹۲۰ء میں اس کی اشاعت موقوف ہو گئی۔[3] اس ماہنامہ کے مرتب سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) تھے۔

ہوش بلگرامی ادیبوں میں بحیثیت ادیب، شاعروں میں بحیثیت شاعر اور سیاستدانوں میں بحیثیت سیاستدان اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ذہین آدمی تھے اور مزاج داں بھی اس وجہ سے سیاست کے میدان میں اپنا سکہ خوب چلایا اور کنگ کوٹھی کی فضا میں بہت جلد ان کا طوطی بولنے لگا۔ لیکن بقول محترمہ زینت ساجدہ دربار داری کے اس فن نے انھیں بنایا بھی اور بگاڑا بھی

[1] مجلہ عثمانیہ (جامعہ عثمانیہ نمبر) ص۵۵
[2] تاج، جولائی اگست ۱۹۱۵ ص۲۰
[3] داستان ادب حیدرآباد (جلد سوم) مولفہ مالک رام و مشل داد
[4] حیدرآباد کے ادیب جلد دوم ص۹۵ مرتبہ زینت ساجدہ

شاعری میں کوئی بڑا مقام پیدا نہ کر سکے البتہ نثر میں ان کی ایک ابتدائی کتاب بیسیہ گلشن پر شائع ہوئی تھی بے حد مقبول ہوئی۔ ان کی تصنیف میں فروغ ادب، ہماری جنت، پریشیاں اور شاہدان شوخ، طوفان محبت قابل ذکر ہیں۔ وہ بلگرام کے رہنے والے تھے لیکن عنفوانِ شباب میں حیدرآباد چلے گئے اور یہیں کے ہو رہے۔۔۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی حیدرآباد ہی سے ہوا جہاں انھوں نے ۱۹۱۰ء میں ذخیرہ جاری کیا جو ۱۹۱۸ء تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ ۱۹۱۸ء میں شہر چھوڑا تو ذخیرہ بھی بند ہو گیا۔

جب "ذخیرہ" کا پہلا شمارہ ملک بھر کے ادبی اور نیم ادبی حلقوں میں پہنچا تو ہر طرف سے تعریف و تحسین کا سلسلہ شروع ہوا اور ملک بھر کے تمام شہروں سے امید افزا رائیں دی گئیں چنانچہ ذخیرہ ہی کے صفحات پر "ہمارے باب میں کیا گفتگو ہوئی" کے زیر عنوان مختلف اخبارات کی آرا شائع ہوئی ہیں۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں جن اخبارات کی رائے پیش کی گئی ہے ان میں اخبار سیادت، ذوالقرنین (بدایوں)، دبدبۂ سکندری (رامپور)، نیر اعظم (مراد آباد)، مدینہ (بجنور)، مشرق (گورکھپور) اور اخبار اہلحدیث (امرتسر) شامل ہے۔ اخبار سیادت نے جو رائے دی ہے وہ درج ذیل ہے

"ذخیرہ حیدرآباد دکن سے ناظر احسن صاحب ہوش بلگرامی کی ایڈیٹری میں شائع ہوا ہے اور اس میں سب سے پہلے اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کی تصویر مبارک دی گئی ہے اس کے بعد مضامین نظم و نثر سے رسالہ مزین کیا گیا ہے۔ یہ سادہ ادب کی تقطیع پر اور نہایت عمدہ آکوری فنش کاغذ پر نہایت خوشنما چھپائی کے ساتھ طبع ہوا ہے [illegible] ادب ہمارے نزدیک فوقیت حاصل [illegible] نواب عماد الملک جیسے قابل اور اردو [illegible] کی توجہات سے آج تک اردو زبان اپنی [illegible] سے محروم رہی تھی اس رسالے کو علمی اور اعلیٰ مضمون سے مزین [illegible] امید ہے کہ یہ رسالہ نہایت مفید ہوگا اور اردو لٹریچر میں ایک جدید باب کا اضافہ کرے گا۔"

سیادت کی یہ رائے آگے چل کر صحیح ثابت ہوئی۔ ذخیرہ حیدرآباد کے ان چند گنے چنے رسائل میں سے ہے جس نے ہمارے معیارِ ادب کو اونچا کیا اور جدید اصناف نثر اور نئے موضوعات پر ادیبوں کی توجہ مبذول کرائی۔ اس کے لکھنے والوں میں عماد الملک کے علاوہ اعجاز لکھنوی، سید حسن بلگرامی، سید علی اصغر بلگرامی، اور حیدرآبادی کشن پرشاد، نظم طباطبائی، غلام مصطفیٰ ذہین، اظہر دہلوی، تمنا، ب ک، عشرت لکھنوی، سلطان احمد ضمیر نقوی، اثر، نور الحق، خنجر لکھنوی، سید شاہ ولی الدین چشتی، سلطان حیدر جوش، حیدر یار جنگ، عبد اللطیف، خواجہ حسن نظامی، پریم چند اور عبد الماجد قابل ذکر ہیں۔ اس فہرست کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ "ذخیرہ" نے اردو ادب کے ذخیرہ میں جو اضافہ کیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے اور ہمارے شعر و ادب کا ناقابل فراموش ورثہ ہے۔ حصہ نظم علیحدہ فہرست کے ساتھ رسالہ کے نصف سے آخری حصہ میں شائع ہوا کرتا تھا۔ جن شعرا کا تعاون ذخیرہ کو حاصل رہا ہے ان میں ملک کے تقریباً سبھی بڑے شاعر شامل تھے مثلاً طباطبائی، رعد جونپوری، صفی بلگرامی، امیر مینائی، عاصی، شیفتہ کنتوری، غلام مصطفیٰ ذہین، جرأت، جلیل حسن جلیل، اختر مینائی، اظہر، رسا ہمدانی، جنون صدیقی، ہوش بلگرامی، قدسی جاسی، امین احسن سہل، تلوک چند محروم، حسرت موہانی، خنجر لکھنوی اور باسط بسوانی وغیرہ کا کلام بیشتر شماروں میں شائع ہوا ہے۔ ہوش بلگرامی نے ایڈیٹوریل کے رواج کے بجائے مضامین پر نوٹ لکھنے کو اختیار کیا البتہ ذخیرہ کے دوسرے شمارہ میں صفحہ آخر پر جو ایڈیٹوریل لکھا گیا اس میں اردو زبان و ادب کے مسائل سے بحث کی گئی ہے اور مذہبی رسالہ کے بارے میں کوئی بات۔ بلکہ خواجہ کمال الدین ایڈیٹر رسالہ مسلم انڈیا کا تعارف کرایا گیا ہے۔

اردو تنقید کی تاریخ بڑی مختصر ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد شبلی اور حالی کی وجہ سے شعور تنقید عام ہوا۔ لیکن جدید اصولوں کی تدوین اور واضح نقطۂ نظر ۱۹۳۵ء کے بعد جب کہ ترقی پسند تحریک کا چرچا ہوا تنقید میں پیش کیا جانے لگا۔ خصوصاً سائنٹفک تنقید تو اسی ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ رسائل و جرائد میں تنقیدی مضامین یا تو سرے سے شائع ہی نہیں ہوتے تھے اور اگر کہیں نظر بھی آ جاتے تو ان کی تعداد بڑی مختصر ہوا کرتی تھی۔ اور ان مضامین کا انداز بھی بڑی حد تک تبصروں کا سا ہوا کرتا تھا۔ "ذخیرہ" میں اس قسم کے مضامین کی بہتات نہ سہی لیکن کمی بھی نظر نہیں آتی غلام مصطفیٰ ذہین شاعر تو تھے ہی لیکن ناقدانہ نظر بھی رکھتے تھے۔ علی حیدر، اظہر دہلوی اور عبد الماجد کے علاوہ خود ہوش نے بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ تنقیدی مضامین میں حضرت غالب مغفور (غلام مصطفیٰ ذہین)، اثر و شوق (علی حیدر طباطبائی)، دیوان اردوئے غالب اور شوکت میرٹھی (ہوش بلگرامی)، جرأت کا مرقع (شاد)، جناب العدلہ درخشاں (حیدر یار جنگ)، گل و خوبیاں (ہوش بلگرامی)، نقد سخن (اظہر دہلوی)، اور حالی کا رنگ تغزل (عبد السلام) ذخیرہ کے مختلف شماروں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ سبھی نقاد حالی اور شبلی کے نظریات تنقید کا اچھا مطالعہ رکھتے تھے اور ان کی تنقیدوں میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن نظریۂ تنقید کا جہاں تک تعلق ہے حالی اور شبلی سے گریز اور محض ادب کے پیش نظر تنقید کی گئی ہے۔ حالی کے نظریۂ شعری نے شعر و زبان کی دنیا میں نیا انقلاب پیدا کیا تھا جن نئے رجحانات اور نئے میلانات کو اردو شاعری میں روشناس کرایا گیا ایسا معلوم ہوتا ہے بعد کے نقادوں نے کما حقہ اس سے استفادہ نہیں کیا تا آنکہ ترقی پسندوں کا دور آتا ہے۔ ویسے بھی جن نقادوں کے نام اوپر دئے گئے ہیں ان میں مشہور نقاد شاید ہی کوئی ہو سوائے مولانا ماجد کے۔ اور مولانا ماجد تنقید کے اس اسکول سے تعلق رکھتے ہیں جسے رومانویت پسند کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں مولانا ماجد کے نظریۂ تنقید سے بحث نہیں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مولانا ماجد کی تنقید ذخیرہ کے دیگر نقادوں سے کہیں زیادہ شعوری اور اصولی ہوگی کیونکہ ذہین، شاد اور خود ہوش کے یہاں تنقید یا ادب کا نیا شعور اتنا واضح نہیں ہو سکتا جتنا کہ مولانا کا ہو سکتا تھا۔ اور پھر ذخیرہ کا زمانہ ترقی پسند رجحانات سے بہت پہلے کا ہے تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کے یہاں بھی دیگر ہمعصر نقادوں کی طرح حالی کا سماجی اور ثقافتی و تاریخی شعور پایا نہیں جاتا۔ مولانا ماجد ادب کو ادب ہی کی عینک سے دیکھنا جانتے ہیں۔ اس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذخیرہ کا مواد تنقید کوئی زیادہ قابل قدر نہیں ہے اور نہ ہی ترقی کی طرف کوئی اہم قدم ہی کرتا

ہے۔ ویسے تاریخ تنقید ادب کی تدوین اس پرچے کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہ ہوگی۔

"ذخیرہ" کی افادیت تنقیدی نہ سہی افسانوی ضرور ہے۔ افسانہ کا فن نیا ہوتے ہوئے بھی اس رسالہ کے ذریعہ عام ہوا۔ ذخیرہ کے افسانہ نگاروں میں ملک کے مشہور ادیب شامل ہیں۔ اردو افسانہ کا ارتقاء بڑی حد تک پریم چند کا مرہون منت ہے۔ گو اس کی ابتداء سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم سے ہوتی ہے لیکن پریم چند سے اردو کے پہلے افسانہ نگاروں کی تشکیل بنتا ہے۔ سلطان حیدر جوش، یلدرم اور نیاز تینوں کا روایت پسند کہانی نگار ہیں جن پر حب وطنی کا اثر نمایاں ہے۔ پریم چند وہ پہلا افسانہ نگار ہے جس نے کہانی میں انسانی زندگی کو پیش کیا۔ اور اردو افسانہ کو اس طرح حقیقت بنا کر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ پریم چند کا مشہور افسانہ درگاہ کا مندر (ذخیرہ جلد ۱ نمبر ۱) ذخیرہ کی صفحات کی زینت بن چکا ہے۔ ذخیرہ کو تقریباً سبھی افسانہ نگاروں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ جو افسانہ اس کے مختلف شماروں میں شائع ہوتے رہے ہیں ان میں پیکر وفا (مفتی انوار الحق)، مساوات (سلطان حیدر جوش)، جنون ترقی (سلطان حیدر جوش)، نغمۂ دل (عبدالرزاق بسمل)، امتحان وفا (خنجر لکھنوی)، نیرنگی دہر (روش بلگرامی)، جدائی (سلطان علم) فلسفہ زندہ دلی (ضمیر نقوی)، پیرس کا ہیرو (مفتی انوار الحق) شیر اور بیل کا معرکہ (خدیجہ بیگم)، دو شریف زادے (خواجہ حسن نظامی)، درگاہ کا مندر (پریم چند)، حسن تلافی (مفتی انوار الحق) اور نادو بیگم (خنجر لکھنوی) معیاری افسانے ہیں۔ گو ان افسانوں میں سے بعض کا انداز داستانوں کا سا ہے اور بعض کا بچوں کی کہانیوں کا تاہم یہ دور بہر حال اردو افسانہ کا ابتدائی دور ہے اس وجہ سے بڑی حد تک ناقابل نظر انداز ہے۔ درحقیقت افسانہ کی ترقی کا زمانہ بھی اردو تنقید کی طرح ۱۹۲۵ء کے بعد کا ہے جبکہ اردو ادیب، شاعر اور افسانہ نگار حالی، شبلی اور سرسید کی کوششوں کی وجہ سے انگریزی علم و ادب سے مانوس اور پھر بعد کو اچھی طرح واقف ہو چلے تھے ۱۹۲۵ء سے پہلے پریم چند کی افسانہ نگاری نقش اولین کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے حیدر آباد کے رسائل میں "مکتبہ" بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۸ء تک یہ رسالہ پابندی سے شائع ہوتا رہا اس کی تقریباً پوری جلدیں ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں پہلا اور درمیان کے چند ایک شمارے غائب ہیں۔ مختصر سی مدت میں ذخیرہ نے اردو ادب و زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں اردو صحافت کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

مراسلات

زار دہلوی سے بے اعتنائی!

ہماری زبان کی اشاعت مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۹۷ء میں جناب دیوی پرشاد سکسینہ ،حضرت زار دہلوی پر اپنے مضمون میں فرماتے ہیں کہ پروفیسر نفیس سندیلوی نے نگار داغ نمبر ۱۹۵۳ء میں داغ کے مشہور تلامذہ پر ایک مقالہ لکھا ہے اس میں اُن کا (زار دہلوی کا) ذکر نہیں کیا حالانکہ اس مقالہ میں بعض ایسے حضرات کا ذکر کیا ہے جو داغ کے شاگرد نہیں تھے جیسے جگر مراد آبادی اور سیماب اکبر آبادی۔

پروفیسر نفیس کے مقالے کا پورا عنوان ہے "داغ کے بعض مشہور تلامذہ" عنوان میں لفظ "بعض" کی موجودگی صاف ظاہر کرتی ہے کہ مضمون داغ کے تمام نہیں بلکہ چند تلامذہ کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لفظ کے ہوتے ہوئے سکسینہ صاحب کو اپنی شکایت پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ مزید یہ کہ داغ نمبر ہی کے صفحہ ۸۰ پر قمر نارووی نے داغ کے ممتاز شاگردوں میں زار دہلوی کو فراموش نہیں کیا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو جوش ملسیانی نے بھی اپنے مضمون "داغ کے نامور شاگرد" (آج کل دسمبر ۱۹۶۶ء) میں زار دہلوی کے حالات نہیں دیے ہیں لیکن حالات دستیاب نہ ہو سکنے یا مختصر حالات بھی حاصل نہ ہو سکنے پر جوش ملسیانی جن شعرا کے حالات نہیں لکھ سکے ہیں ان کی فہرست میں زار دہلوی کا نام سب سے پہلا ہے اور رسالے کے وسطی صفحات پر مضمون سے متعلقہ تصاویر میں زار صاحب کی تصویر موجود ہے۔

سیماب و جگر

سیماب اکبر آبادی کو سکسینہ صاحب داغ کا شاگرد نہیں مانتے لیکن نہ کوئی حوالہ دیا ہے اور نہ کوئی دلیل پیش کی ہے۔ جہاں تک ایک عام تذکرہ نگاری کی حیثیت سے مجھے معلوم ہے سیماب بلاشبہ داغ کے شاگرد تھے۔ خود سیماب کے رسالے شاعر آگرہ کے سالنامہ ۱۹۳۷ء میں احسن مارہروی کے مضمون "مرزا داغ اور ان کے نورتن" کے تحت صفحہ ۱۰ کے مقابل آرٹ پیپر پر بیضوی دائرے میں داغ کی وسطی تصویر کے گرد نو تصاویر ہیں جن میں ایک تصویر سیماب کی بھی ہے۔ صفحہ ۱۰ پر سیماب اکبر آبادی کے حالات میں احسن صاحب لکھتے ہیں: "۱۸۹۸ء میں آپ کو جہان استاد سے بذریعہ خط و کتابت شرف تلمذ حاصل ہوا"۔ اس اقتباس کے باوجود بھی اگر سکسینہ صاحب کو اس میں کلام ہے کہ سیماب داغ کے شاگرد تھے تو انھیں چاہیے کہ ہماری تشفی فرمائیں۔

جہاں تک جگر کے شاگرد داغ ہونے کا مسئلہ ہے بعض حضرات کو شک ضرور ہے لیکن سکسینہ صاحب نے تو فیصلہ کن انداز میں لکھ دیا ہے کہ جگر داغ کے شاگرد نہیں تھے۔ محمود علی خاں جامعی نے تذکرہ جگر کے صفحہ ۱۰ پر اور شارب ردولوی نے "جگر فن اور شخصیت" کے صفحہ ۱۸ پر جگر صاحب کی ذاتی تحریر اور بیان کے مطابق لکھا ہے کہ ابتدا میں انھوں نے داغ سے اصلاح لی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت پر شک صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ جگر کا سنہ پیدائش ۱۸۹۰ء مان لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلام نے بھی "جگر مراد آبادی، حیات اور شاعری" میں یہی سنہ مان لینے کی سفارش کی ہے۔ لیکن صفحہ ۵۱ پر ڈاکٹر ہی صاحب کے دیے ہوئے حوالے کے مطابق سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا یہ بیان بھی قابل توجہ ہے کہ "ان کے (جگر کے) بعض ملنے والوں کا خیال ہے کہ ان کا سنہ پیدائش ۱۸۹۰ء سے پہلے رہا ہوگا کیونکہ جب وہ ۱۹۲۰ء میں اعظم گڑھ آتے ہوتے تھے تو اپنے ۳۰ سال کا بتاتے تھے۔"

ضرورت اس بات کی ہے کہ ۱۸۹۰ء کے مفروضے پر یہ ثابت کرنے کی کوشش سر دست ترک کر دی جائے کہ جگر داغ کے شاگرد نہیں تھے کوشش اس بات کی ہو کہ جگر کا حتی الامکان اور صحیح سنہ پیدائش متعین کر لیا جائے۔ یہ کام مشکل تو ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ (ظفر الاسلام اعظمی)

اردو میں خواتین کا اولین ناول

"ہماری زبان" مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۹۷ء کے شمارہ میں "اردو میں ناول نگار خواتین" کے عنوان سے بیگم نسیم اقتدار علی صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ موصوفہ نے شوکت آرا بیگم (۱۹۰۶ء) کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے جو کسی خاتون نے تحریر کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ لکھنؤ کا پہلا ناول ہے جو کسی خاتون نے تحریر کیا لیکن اسے اردو کا پہلا ناول کسی طرح نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اس سے بہت عرصہ قبل بہار کی بیگم رشید النسا اہلیہ مولوی یحییٰ علی صاحب، ایک سماجی و اصلاحی ناول "اصلاح النسا" کے نام سے لکھ چکی ہیں جس کی موجودگی میں کسی دوسرے ناول کو خواتین کا اولین ناول قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔

(سید سلیمان حسین شہنشاہ بلڈنگ نخاس لکھنؤ)

بیجاپور کی اردو مثنویاں

میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیے "بیجاپور کی اردو مثنویاں" پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے تمام بیجاپوری مثنویاں (عادل شاہی عہد) سے استفادہ کر چکا ہوں۔ تاہم یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی کتنی مثنویاں ایسے گوشوں میں دبی ہیں جن تک میری رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ میں ان تمام حضرات سے جنھیں دکنی ادب سے دلچسپی ہے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ان کے پاس بیجاپور کی کوئی مثنوی ہو یا وہ کسی اور مثنوی سے واقف ہوں تو پتہ ذیل پر مجھے مطلع فرمائیں۔

(قیوم صادق احمد پوری ایم اے
لکچرار شعبہ اردو گورنمنٹ مہارانی کالج میسور ۔ ۱)

ریاستی شاخ آندھرا کے کارکنوں کے سالانہ اجتماع میں
حبیب الرحمٰن صاحب کی تقریر

حیدرآباد ۷ رجنوری: ریاستی شاخ آندھرا پردیش کے کارکنوں کے چوتھے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جناب حبیب الرحمٰن معتمد شاخ آندھرا نے کہا کہ ریاست آندھرا پردیش میں انجمن ترقی اردو کے کارکنوں کا یہ چوتھا سالانہ اجتماع ہے جس میں شرکت کے لیے آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ میں ریاستی انجمن اور اس کی مجلس انتظامی کی طرف سے آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں اور خاص کر ہمارے ان ساتھیوں کا شکر گذار ہوں جو بڑی تکلیف اٹھا کر اور مالی بار برداشت کر کے ریاست کے مختلف اضلاع اور تعلقات سے اس اجتماع میں حصہ لینے کے لیے تشریف لائے ہیں اردو زبان سے ان کے دلی لگاؤ کا یہ بدیہی ثبوت ہے۔

حضرات۔ آج جن حالات میں ہم یہاں جمع ہوئے ہیں وہ ہمارے وطن عزیز کے لیے کئی اعتبار سے پریشان کن ہیں۔ کرنسی ڈی ویلیوشن یعنی روپیہ کی قدر گھٹا دینے کے باوجود معاشی صورت حال کی متواتر ابتری، قحط کے حالات گزر جانے اور اچھی فصلیں ہونے کے باوجود ضروریات زندگی کی قیمتوں میں اضافہ، زبانوں کے بارے میں انتشار کی کیفیت، ریاستوں کے درمیان پانی کی تقسیم اور حد بندی کے جھگڑے، فرقہ وارانہ فسادات کی کثرت، عوام میں تشدد کی طرف روز افزوں میلان، ملکی قوانین کی بے حرمتی ریاستوں میں سیاسی پارٹیوں کے مابین اقتدار کے لیے رسہ کشی اور مسلمہ جمہوری روایات کی پامالی یہ ایسے رجحانات ہیں جو خیر خواہان وطن کے لیے دل خوش کن نہیں ہو سکتے۔ ضرورت ہے کہ ملک کے ذمہ دار افراد کچھ دنوں کے لیے اپنی چھوٹی چھوٹی وفاداریوں کو چھوڑ کر اور سچے ایثار و بے غرضی سے کام لے کر ان رجحانات کو پھیلنے سے روکیں تاکہ ملک مضبوط اور عام خوشحالی کے لیے راستہ ہموار ہو۔

زبان کے تعلق سے آج کل ملک میں جو ہڑبونگ مچی ہوئی ہے اس سے ہر وطن دوست اپنے دل میں ایک خلش محسوس کر رہا ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ، جہاں دیدہ، عمر رسیدہ، تجربہ کار، سیاست داں جس تعصب تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا کہا جائے۔ ہندی پریمیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ جو کچھ بھی اس سلسلے میں کر رہے ہیں وہ سراسر قومی یکجہتی کی خاطر ہے لیکن ان کی حرکتوں سے جو نتائج پیدا ہو رہے ہیں ان سے ملک کی رہی سہی یکجہتی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہندی ریاستوں میں اردو کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے اور ہندی کے بعض سیاسی سرپرست اردو کا واجبی حق طلب کرنے والوں پر جو طرح طرح کے الزام لگا رہے ہیں، غیر ہندی ریاستوں کو زود رنج کرنے میں اس کا بھی کافی حصہ ہے۔ گزشتہ عام انتخابات کے بعد سے خاص کر یوپی اور بہار میں بعض فرقہ پرست تنظیموں کی اردو دشمنی بہت کھل کر سامنے آ گئی ہے اور وہاں کے سیاسی بازی گروں نے اردو کو اپنا کھلونا بنا لیا ہے ان ریاستوں میں متحدہ محاذ کی حکومتوں کا اردو کے ساتھ طرز عمل اس کا بدیہی ثبوت ہے۔ اب اردو بولنے والوں میں بھی ان حرکتوں کا ردعمل شروع ہو گیا ہے۔ اردو محاذ دستہ کی تحریک ان ہی حالات کا نتیجہ ہے اردو کے حقوق کی خاطر اب لوگ کھلے بندوں گلی کوچوں کے میدان میں آ گئے ہیں۔ جلسوں، جلوسوں، بھوک ہڑتالوں کا سلسلہ جاری ہے اور ہمارے دو سورماؤں نے حال میں اردو کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کر دیا ہے۔ اس تحریک میں سب سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ اس میں حصہ لینے والے کسی ایک ہی مذہب کے پیرو نہیں ہیں۔ چنانچہ شہیدان اردو کی فہرست کا آغاز جن دو ناموں سے ہوا ہے ان میں سے ایک کانپور کے پنڈت دیوزائن پانڈے ہیں اور دوسرے اعظم گڑھ کے جے بہادر سنگھ ایم پی ہیں۔ مختصر یہ کہ ملک میں زبانوں کے تعلق سے جو انتشار کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس سے اردو بولنے والوں کا متاثر ہونا بالکل قدرتی بات ہے خاص کر ایسی صورت میں جب کہ گزشتہ بیس سال سے اردو کو کچلنے کی برابر کوششیں جاری ہیں۔

خوش قسمتی سے ہماری ریاست میں حالات ابھی اتنے نازک نہیں ہوئے ہیں۔ اس لیے ہمیں ایسے ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے ساتھ ہی ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ آندھرا پردیش میں اردو کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہو رہا ہے اور اردو کی حالت یہاں بھی کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتی۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ موجودہ صورت حالات کا جائزہ لے کر ایک ایسی راہ عمل متعین کر لی جائے جسے اختیار کر کے ہم اپنی زبان کی بقا اور ترقی کا بھی سامان کر سکیں اور ساتھ ہی دوسری زبانیں بولنے والے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ مل کر ملک کی عام ترقی میں بھی برابر کا حصہ لے سکیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اب یہ طے شدہ بات ہے کہ آئندہ سے ریاستوں میں تمام سرکاری کاروبار خواہ ان کا تعلق دفتروں سے ہو یا عدالتوں سے یا قانون ساز مجلسوں سے، عام طور پر وہاں کی علاقائی زبانوں میں انجام پانے لگے گا۔ نیز مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیادہ تر علاقائی زبانوں ہی کے ذریعہ تعلیم دی جانے لگے گی۔ ایسی صورت میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو بولنے والی اقلیتیں جو کم و بیش ہر ریاست میں لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں کیا پالیسی اختیار کریں ظاہر ہے کہ ان سے یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے علاقہ کی اکثریتی زبان کو اس طرح اپنا لیں کہ چند سال بعد وہی ان کی مادری زبان بن جائے۔ ایسا مطالبہ عاقلانہ منصفانہ ہے اور نہ وہ قانون قدرت ہی کے مطابق ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے چند نادان اور متعصب افراد کو چھوڑ کر کوئی سمجھ دار آدمی ایسا مطالبہ نہیں کرتا۔ لیکن دوسری طرف موجودہ زمانے میں کسی طبقۂ آبادی کے لیے یہ بات بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے علاقہ کی اکثریتی زبان سے بالکل لاپروا ہو کر معاشرے میں اپنا واجبی مقام حاصل کر سکے مثال کے طور پر آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں کے لیے لازمی

ہے کہ وہ تلگو سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کریں تاکہ عوامی زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ بھی اپنا حصہ ادا کر سکیں۔ اس کے لیے یہ بات قطعی ضروری نہیں ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے بے بہرہ رہیں کیوں کہ وہ اپنی تعلیم ہر سطح پر اردو ہی کے ذریعہ حاصل کریں گے۔ اب رہا تیسری زبان کا سوال۔ اول تو ہر شخص کے لیے تین زبانیں جاننا ناگزیر نہیں ہے۔ اردو بولنے والے اپنی مادری زبان کے علاوہ اگر تلگو بول چال اور تلگو لکھنا پڑھنا سیکھ لیں تو وہ بلا کسی دشواری کے یہاں کی معاشرتی زندگی کے ہر شعبے میں بھرپور حصہ لے سکتے ہیں۔ تیسری زبان کی ضرورت صرف ان مٹھی بھر افراد کو محسوس ہوگی جو ریاست سے باہر کل ہند سطح پر یا اس سے بھی آگے عالمی میدان میں قسمت آزمائی کرنا چاہیں گے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد قدرتی طور پر بہت کم ہوگی۔ ان لوگوں کو اختیار ہے کہ وہ ہندی یا انگریزی ان میں سے کوئی ایک یا اگر ہمت ہو تو دونوں زبانیں سیکھ لیں۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے اردو بولنے والے صرف دیوناگری رسم خط سیکھ لیں تو کافی ہے کیونکہ وہ اپنی بول چال کی زبان کو دیوناگری رسم خط میں لکھ دیں تو یقیناً وہ عام ہندی سے زیادہ مختلف نہ ہوگی۔

یہی وہ اہم اصول ہیں جن پر انجمن ترقی اردو کی لسانی پالیسی کی بنیاد ہے اور انہی کو سامنے رکھ کر انجمن نے وہ مطالبات مرتب کیے ہیں جو بار بار ریاستی حکومت کی خدمت میں پیش کیے جاتے رہے ہیں مجھے بڑا دکھ ہے کہ اب تک حکومت نے ہمارے مطالبات کی طرف مناسب توجہ نہیں کی۔ ہمیں توقع تھی کہ سرکاری زبان کے قانون میں ان مطالبات کو جگہ دی جائے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ پوری نہیں ہوئی۔ صرف اشک شوئی کے طور پر قانون میں ایک دفعہ شامل کر دی گئی ہے جو انتہائی ناقص اور ادھورا اور ناکافی ہے اور ستم یہ کہ تقریباً دو سال گزر گئے اور اس ناقص دفعہ پر بھی عمل آوری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اسی بنا پر انجمن کا ایک وفد گذشتہ ستمبر میں چیف منسٹر صاحب سے ملا اور ایک یادداشت ان کی خدمت میں پیش کی جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ چیف منسٹر صاحب نے اس موقع پر وزیر متعلقہ کو بھی بلا لیا تھا اور گفتگو کے بعد ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ وزیر صاحب جلد ہی انجمن کے نمائندوں سے مشورے کے بعد ہماری شکایتوں کو رفع کرنے کے لیے ضروری قدم اٹھائیں گے ڈیڑھ مہینہ ہوا ہم نے وزیر صاحب کی خدمت میں یاد دہی کے طور پر ایک چٹھی روانہ کی لیکن موصوف نے اس کے وصول ہونے کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ شاید جمہوری اخلاق کا یہی تقاضا ہو۔

بہر حال ہمیں کسی حالت میں بھی مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنی جدوجہد کو اور زیادہ تیز کر دینا چاہیے اپنی کوششوں میں باقاعدگی اور تنظیم پیدا کرنی چاہیے اپنے مطالبات کی واجبیت سے تلگو بولنے والے بھائیوں کو واقف کراتے ہوئے ان کی ہمدردی حاصل کرنی چاہیے اور ہر قسم کی تشدد اور ہنگامہ آرائی سے ہٹ کر ایک پر امن منظم اور موثر تحریک چلانی چاہیے تاکہ ارباب اقتدار ہمارے مطالبات کی طرف متوجہ ہوں اور اردو زبان کو ہماری سوشل زندگی میں اس کی واجبی جگہ حاصل ہو جائے۔ امید ہے کہ ہمارا یہ اجتماع اس مسئلے پر خصوصی غور و بحث کے بعد آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں کی ضروری رہنمائی کرے گا۔

اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے اردو تعلیم کی جیسی کچھ اہمیت ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر ہم اردو تعلیم کے راستے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان پر ہر سال غور کرتے اور محکمہ تعلیمات کو ان کی طرف متوجہ کراتے ہیں۔ اس سال بھی ہمیں اپنے تعلیمی مسائل کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہمارے اضلاعی اور مقامی شاخوں کے کارکن جانتے ہیں کہ اردو ذریعہ تعلیم کی جماعتوں کے کھلوانے، اردو اساتذہ کا تقرر کرانے اور اردو کی نصابی کتابیں مہیا کرنے میں انھیں کیسی کیسی رکاوٹوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ سب سے زیادہ حیرانی ہمیں اس وقت پیش آتی ہے جب افسران متعلقہ کی طرف سے کسی متوازی اردو جماعت کے کھولنے پر یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ خواہشمند افراد ایک معینہ رقم فراہم کریں کلاس کے لیے کمرے اور ضروری فرنیچر کا انتظام کریں اور کھیل کے میدان مہیا کریں۔ غور فرمائیے کہ دیہات کے غریب باشندے کیسے ان مطالبات کی تکمیل کر سکتے ہیں اور ان کڑی شرائط پر قائم رہ کر ہم کب اپنے ملک سے عام جہالت کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ توقع تھی کہ پنچایت راج کے قائم ہونے سے اضلاع و دیہات کے عوام کو حصول تعلیم میں کچھ سہولتیں حاصل ہوں گی لیکن یہاں بھی ہمیں مایوسی ہی کا سامنا ہے بلکہ بعض مقامات پر تو ضلع پریشدیں اور پنچایت سمیتیاں اشاعت تعلیم کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوئی ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ اعلیٰ تعلیم کا ہے یہ اعلان ہو چکا ہے کہ ۱۹۶۹ء میں شروع ہونے والے سال تعلیمی سے دوسری ریاستوں کی طرح آندھرا پردیش کی یونیورسٹیوں میں بھی یہاں کی علاقائی زبان تلگو ذریعہ تعلیم بن جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت اردو مادری زبان والے طلبا کے لیے کیا انتظام ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہر یونیورسٹی میں تلگو کے ساتھ حسب ضرورت اردو میڈیم کے کالج بھی کھولے جائیں۔ اسکولوں کی طرح کالجوں میں بھی اردو مادری زبان والے طلبہ تمام مضامین کی تعلیم اردو میڈیم سے حاصل کریں گے اور تلگو بطور دوسری لازمی زبان کے سیکھیں گے۔ اس طرح آٹھ دس سال تک تلگو سیکھنے کے بعد وہ یقیناً اس قابل ہو جائیں گے کہ خود کو معاشرے میں اجنبی نہ محسوس کریں اور معاشی میدان میں بھی دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔

حضرات، اب میں آپ کی خدمت میں ایک گزارش پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ موجودہ زمانے میں کسی زبان کی ترقی کے لیے حکومت کا تعاون بہت ضروری ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اس سے کہیں زیادہ ضروری خود اس زبان کے بولنے والوں کا شعور اور اس کی خاطر ان کا جذبہ ایثار ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اردو بولنے والے اس بارے میں خود اپنا فرض کما حقہ انجام دے رہے ہیں۔ میرا یہ احساس ہے کہ ہماری طرف سے اس سلسلہ میں بڑی کوتاہیاں ہوئیں اور اب بھی ہو رہی

ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج ہمارے تعلیم یافتہ خاندانوں میں ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں اردو لکھنے پڑھنے سے محروم نظر نہ آتیں، ہمارے اکثر اخبارات و علمی رسائل خریدار نہ ملنے کے باعث دم توڑتے دکھائی نہ دیتے، ہمارے اچھے لکھنے والے عدم سرپرستی کے ڈر سے اپنی تخلیقات کو پیش کرنے سے نہ ہچکچا رہے ہوتے، ہمارے کتب خانے اور دارالمطالعے اکثر و بیشتر بند پڑے ہوئے نہ ہوتے اور جو ادارے کچھ نہ کچھ اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں وہ وسائل کی کمی کے سبب خطرے میں نہ ہوتے۔ اردو بولنے والوں سے میری یہ التجا ہے کہ وہ مسئلے کے اس پہلو پر بھی ذرا غور فرما لیا کریں اور اپنے ضمیر سے کبھی کبھی یہ پوچھ لیا کریں کہ اردو کے ساتھ ان کی ہمدردیاں کہیں صرف زبانی جمع خرچ تک تو محدود نہیں ہیں۔

ریاستی انجمن ترقی اردو آندھرا کی اضلاعی شاخوں کے صدر و معتمدین کا سالانہ اجتماع

حیدرآباد ۵۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی اضلاعی شاخوں کے صدور و معتمدین کے چوتھے سالانہ دو روزہ اجتماع کا آج سہ پہر اردو ہال حمایت نگر میں افتتاح ہوا۔ (۲۰) کے منجملہ (۱۵) ریاستی اضلاع میں دا (۴۲) شاخوں کے (۱۰۲) مندوبین اس اجتماع میں شرکت کر رہے ہیں۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب صدر انجمن ترقی اردو ہند شاخ آندھرا پردیش نے اس اجتماع کی صدارت کی۔ تلنگانہ سے سب سے زیادہ ضلع میدک سے (۲۶) اور آندھرا سے سب سے زیادہ اننت پور سے (۵) مندوبین نے شرکت کی۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دراصل ہندوستانی رابطہ کی زبان صرف اردو ہی ہے اس زبان کی ترقی اور وسعت سے رابطہ کی زبان کے موجودہ تمام جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ ملک کے بعض تنگ نظر اور کوتاہ فہم افراد نہ صرف اردو بلکہ دیگر زبانوں کی ترویج و اشاعت کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں جس کی وجہ دیگر زبان والوں میں ہندی والوں سے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ نواب صاحب نے محبان اردو سے کہا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کے جمود کو حرکت میں بدل دیں اور اردو کے کام کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ انھوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ آندھرا پردیش میں اردو کے لیے بہتر اور سازگار ماحول ہے۔ جناب حبیب الرحمٰن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے کہا کہ مختلف سرکاری محکموں سے جو شکایات وصول ہوئی ہیں اور اردو کو نافذ کرنے میں جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں ان اجلاسوں میں اس کا جائزہ لینا ضروری ہے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اردو کی شاخیں قاعدے اور ضابطے کے تحت جا بجا قائم کر لی جائیں، اردو کے بہی خواہوں کو چاہیے کہ اس کے نفاذ میں جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں اس کا جائزہ لیں اور اس کا حل معلوم کریں۔ جناب حبیب الرحمٰن نے مشورہ دیا کہ ضلعی سطح پر سال میں کم از کم ایک مرتبہ اس قسم کے اجتماعات منعقد کیے جائیں۔ اجلاس میں جناب سرتیواس لاہوٹی، حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس ایوننگ کالج کے علاوہ اضلاعی مندوبین میں جناب نصرت فاروقی (محبوب نگر)، سید پیراں نقال (اننت پور)، جناب رشید احمد صاحب (کڑپہ)، رفیق احمد (کرنول)، منیر احمد (سری پیٹا)، ابوالمکارم غازی الدین کمال (کریم نگر)، سید مظفر (کاماریڈی)، ایم۔ اے لطیف (ہندوپور)، علی پاشی (وادھونی)، غلام احمد مصطفےٰ (پروددٹور)، محمد حفیظ الدین (بالکنڈہ) اور خواجہ معین الدین (کاماریڈی) نے بھی خطاب کیا۔ جناب یونس سلیم صاحب مرکزی نائب وزیر قانون نے شام کے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے یونس سلیم صاحب نے کہا کہ سیاسی جماعتوں نے اردو کے متعلق جو رویہ اختیار کیا ہے وہ منصفانہ نہیں ہے ہندوستان میں اردو کے کارکنوں نے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جس سے حکومت کو شکایت کا موقع ملے اور نہ ہی دستور اور قانون سے ہٹ کر کوئی کام کیا گیا۔ نائب وزیر قانون نے کہا کہ اس وقت ملک میں زبان کے مسئلہ پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سارے ملک کے لیے تشویشناک ہے ہندی اور انگریزی کے تعلق سے جو بد دلی پیدا کی جا رہی ہے اس سے مسائل حل نہ ہوں گے بلکہ مسائل اور الجھ جائیں گے یہ کوئی صحت مند پہلو نہیں ہے اس سے پارلیمانی جمہوریت کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ حکومت آندھرا پردیش نے زبان کے مسئلہ پر توازن اور ہم آہنگی قائم کی ہے اور اس نے اس خصوص میں جو راہ اختیار کی ہے وہ دوسری ریاستوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ جناب یونس سلیم نے کہا کہ آندھرا پردیش میں اردو کے تعلق سے بے مثال کام ہو رہا ہے اردو کے بہی خواہ جو یہاں جمع ہوئے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ اپنے اپنے مقامات پر تعمیری کام انجام دیں۔ جناب یونس سلیم نے یقین دلایا کہ اس وقت تک انھوں نے اپنی عوامی زندگی میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس پر آخر وقت تک قائم رہیں گے وہ مصلحت بینی سے کام نہیں لیں گے اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں حقائق کے اظہار میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ ابتداء میں جناب حبیب الرحمٰن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے انجمن کے نمائندوں کی طرف سے جناب یونس سلیم کا خیر مقدم کیا۔

افتتاحی جلسے کے بعد ۸ رجنوری کو انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا چوتھا سالانہ دو روزہ اجتماع اردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا جس میں ریاست میں اردو کے موجودہ موقف پر روشنی ڈالی گئی اور ریاست میں اردو کے موقف کو مضبوط اور مستحکم بنانے پر زور دیا گیا۔ ڈاکٹر عباس عارف نصر نائب صدر اعلیٰ عرب لیگ مشن ہندوستان نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر میں اردو کو بین الاقوامی زبان قرار دیا اور کہا کہ عربوں کو بھی اردو سے انس اور محبت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو اور عربی کا رسم الخط ایک ہی ہے۔ اردو زبان میں ہمہ گیریت اور جاذبیت ہے اردو بڑی خوبصورت ہے دلکش زبان ہے جو فارسی اور عربی سمجھتا ہے وہ اردو بھی سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر عباس نے کہا عرب ممالک کل سے زیادہ آج متحد ہیں ہندوستانی بھی متحدہ قومیت کے نتیجہ سامنے آئیں گے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے "لسانی اقلیت کے مسائل" کے زیر عنوان اپنی تقریر میں کہا کہ اردو اقلیتی زبان تاریخی اتفاقات کی شکل میں ہے اترپردیش اور بہار میں اردو اور ہندی کا وہ ربط نہیں ہے جس طرح ہمارے یہاں تلگو اور اردو کا ہے انھوں نے بتایا کہ دکن میں اردو کا موقف شمال کے مقابلے میں بہت مضبوط ہے بول چال اور گھریلو

زبان کے اعتبار سے اردو کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ دکن میں اردو اور ہندی کے درمیان جو زہر گھولا جا رہا ہے اس کا سوتہ بند کیا جائے۔ ہماری یہ خواہش ہونی چاہیے کہ اردو ہندی کا شمالی سنگم بنا رہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کہا کہ یو پی میں بڑا ظلم ہو رہا ہے۔

انھوں نے کہا کہ آندھرا پردیش میں اردو داں عوام تلگو پر عبور حاصل کریں۔ بیرسٹر اکبر علی خاں ایم پی نے اپنی تقریر میں کہا کہ جب آندھرا پردیش میں ذریعہ تعلیم تلگو ہوگی تو اس وقت اردو کالج کا قیام کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ اردو بولنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس جانب رجوع ہوں۔ ہم تو اردو یونیورسٹی کا قیام چاہتے ہیں لیکن یہ خیال بھی آتا ہے کہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے کہاں سے آئیں گے۔ اردو کی خدمت کے لیے نئی نسل کو اردو ہی میں تعلیم دی جانی چاہیے یہی بہتر خدمت ہے۔ پروفیسر علی اکبر نے کہا کہ ہندی کے بجائے اگر ہندوستانی زبان کو قومی زبان کی حیثیت دی جاتی تو آج ہندی کا جو حشر ہو رہا ہے وہ نہ ہوتا۔ انھوں نے اردو داں طلبہ کو تلگو سیکھنے پر زور دیا۔ جناب منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ نے عدالتوں میں اردو کے چلن کی کمی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنی غرض عوام کی پسند کی زبانوں میں عدالتوں میں کام کیا جانا چاہیے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں کہا کہ جب تک لسانی تعصبوں کو نہیں سمجھا جائے گا اس وقت تک ملک کی زبانوں کو ترقی کے مواقع فراہم نہیں ہو سکتے۔ دستور میں ہندی کو رابطہ کی زبان تسلیم کیا تھا۔ ہندی والوں کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے بعض علاقوں میں اردو والوں کو بھی زحمت برداشت کرنی پڑ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی والوں کو سمجھنا چاہیے کہ زبانوں کو کسی جبر یا دباؤ سے نہیں مٹایا جا سکتا۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے اردو ہندی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ اجلاس میں اضلاع سندھ میں جناب اسمٰعیل قریشی ایڈوکیٹ (عادل آباد)، عبدالمنان قمر (کونسل) ایڈونگ راؤ (تلنگانہ) محمد حنیف (مہاسیرت) ناصر الدین انصاری (تلنگانہ)، شیخ احمد ( ) احمد حسین (میدک) اور سردار جتیں (جوگی پیٹ) نے بھی تقریریں کیں۔ دو روزہ چوتھے سالانہ اجتماع کے دوسرے دن کی پہلی نشست جناب سریشواس لاہوٹی کے شکریہ پر اختتام کو پہونچی۔

حلقۂ ادب رانچی کی تشکیل نو

رانچی: مقامی بہی خواہان اردو ادب کی ایک نشست "قبلہ نما" پرہلٹوں رانچی میں منعقد ہوئی جس میں "بزم فکر" اور "حلقۂ ادب" رانچی کے انضمام کا فیصلہ کیا گیا۔ دونوں ہی ادبی انجمنوں کے ارکان نے اردو ادب و زبان کی ترقی و ترویج کے لیے مل جل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک نئی مجلس عاملہ و سرپرست کا انتخاب عمل میں آیا۔ نئی انجمن "حلقۂ ادب" رانچی کے نام سے ہی موسوم ہوگی۔

آل انڈیا پنجابی کانفرنس کے نام صدر اردو کمیٹی بمبئی کا پیغام

پنجابی ساہتیہ اکیڈمی لدھیانہ کے نویں آل انڈیا پنجابی ادبی کانفرنس کے انعقاد پر اردو کمیٹی کے اراکین، بمبئی کے اردو دوستوں، اردو ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے صدر اردو کمیٹی بمبئی جناب کرشن چندر نے ایک پیغام بھیجا ہے جس میں انھوں نے اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے اپنی نیک تمناؤں کے اظہار کے ساتھ کہا کہ پنجابی یہاں پہلے بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی لیکن آزادی کے بعد سے تو بمبئی پنجابی کا ایک بڑا مرکز بن گئی ہے اور پنجابی کانفرنس کا اس شہر میں منعقد ہونا اس بات کی دلیل ہے۔

بمبئی کی اس پنچ میل کلچرل زندگی میں اردو زبان، اردو ادب اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک خاص اہمیت ہے، مختلف تاریخی وجوہ سے، جن میں فلمی دنیا کی کشش بھی ایک وجہ ہے، اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد بمبئی میں اکٹھا ہو گئی ہے۔ اس وقت اگر بمبئی ہی کو اردو ادب کا سب سے بڑا مرکز کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اردو کو ملک کے جس علاقے نے پناہ دی تھی وہ پنجاب ہی تھا، اس وقت اردو کا پودا تقریباً سوکھ چکا تھا اور آج اگر یہ ہرا بھرا نظر آتا ہے تو محض اس لیے کہ اسے پنجابی ادیبوں اور شاعروں نے اپنے خون جگر سے سرسبز و شاداب بنایا ہے۔ انھوں نے ہی اردو زبان کو، اردو ادب کو پنجابی کی شگفتگی اور توانائی بخشی ہے، اور یہ حقیقت ہماری زبان کی تاریخ میں ہمیشہ آب زر سے لکھی جائے گی۔ ایسی حالت میں مجھے یہ کہنے دیجیے کہ جہاں پنجابی آپ کی میراث ہے، وہیں اردو بھی آپ کا ورثہ ہے۔ اور آپ جہاں اس پر ناز کر سکتے ہیں کہ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں نے پنجابی کو مالا مال کیا ہے، وہیں اس کا بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اردو کی تعمیر میں بھی آپ کے لہو اور آپ کے آنسوؤں کا بڑا حصہ ہے۔

آج بھی کتنے ہی ایسے ادیب ہیں جو پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں، ان کی سب سے ممتاز اور روشن مثال آپ کے یہاں بمبئی کے پنجابی ساہتیہ کیندر کے صدر اور میرے دوست راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت ہے۔

(ایک نامہ نگار)

ہماری زبان
کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر امین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا